قرآن مجید کا طرزِ استدلال

افتخار احمد بلخی۔ استاذ شعبۂ معارف اسلامیہ جامعہ کراچی

سلسلۂ رسالت کے جاری کئے جانے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مبعوث ہونے اور کتب الٰہیہ کی تنزیل کا مقصد اگر دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ ہے ــــ "تزکیۂ نفس"۔ یہی تزکیۂ نفس رسالت محمدی کی غرض اور قرآن مجید کے نازل کئے جانے کا بھی مقصد ہے۔

لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (القرآن)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ اس نے ان میں خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان میں اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس لئے تزکیۂ نفس کے لئے ضروری تھا کہ ایک طرف تو حق و صداقت پر قلوب کو پوری طرح مطمئن کیا جائے اور دوسری طرف باطل کی ساری تشکیکات کا قلع قمع کیا جائے۔ اس بنا پر قرآن نے نہ صرف یہ کہ حق کو پیش کیا ہے، بلکہ حق کے حق ہونے اور باطل کے فساد سے متعلق مسکت براہین بھی دیئے ہیں، چنانچہ مذکورہ آیت اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کیونکہ اس میں رسولؐ کی ذمہ داری سے متعلق تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے تلاوت آیات (یتلوا علیھم آیاتہ) اس کے بعد بعثت رسول یا نزول قرآن کی غرض و غایت یعنی تزکیۂ نفس (یزکیھم) پھر تعلیم کتاب و حکمت (یعلمھم الکتاب والحکمۃ) تاکہ اس کتاب کی تعلیم کے بعد حق کھل کر سامنے آجائے اور باطل کا فساد پوری طرح عیاں ہو جائے۔

قرآن کے یہ دلائل و براہین، جیسا کہ علماء کا قول ہے، علم مباحثہ کی تقریر سے تمام انواع و اقسام پر مشتمل ہیں لیکن قرآن نے متکلمین کے طریقوں اور علم بحث و مناظرہ کے اسلوبوں کی اتباع کئے بغیر بالکل سادہ انداز سے اور اہل عرب کی عادت کے مطابق ان دلائل و براہین کو پیش کیا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم (القرآن)

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، تو اس کی قوم ہی کی زبان میں پیغام بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے

ظاہر ہے کہ قرآن کے اوّلین مخاطب اہل عرب تھے اور نزول قرآن کے وقت نہ متکلمین کا طریقہ استدلال رائج تھا اور نہ اہل عرب اس اسلوب سے آشنا تھے، اس لئے تبیین و توضیح کیلئے (لیبین لھم) وہی انداز اور وہی اسلوب اختیار کیا گیا جو اہل عرب کی عادت سے مطابقت رکھتا تھا تاکہ انہیں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ خداوندا! تیری بھیجی ہوئی تعلیم تو ہماری سمجھ میں نہ آئی تھی پھر ہم اس پر ایمان کیسے لاتے۔

اس کی ایک وجہ، جیساکہ علامہ سیوطی نے "اتقان" میں ذکر کیا ہے، یہ بھی ہے کہ برہان و حجت کے پیش کرنے کے غامض طریقوں اور ثقیل انداز استدلال کو وہی اختیار کرتا ہے جو واضح ترین کلام کے ساتھ حجت قائم کرنے سے قاصر ہوتا ہے، ورنہ وہ شخص کبھی غامض کلام اور چیستاں بنانے کا طرز اختیار نہیں کرے گا۔ جو اتنا قادر الکلام ہو کہ نہایت وضاحت اور سہل انداز سے اس طرح مدعا بیان کرے کہ ہر شخص اور ہر مرتبہ ذہن والا انسان سمجھ سکے اور جب قرآن کلام الٰہی ہے تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ زبردست حجت اور مستحکم سے مستحکم استدلال کو نہایت واضح اور نہایت سہل انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہونے کے نقص و عیب سے پاک ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس طریقہ پر قادر ہے، تو پھر وہ ایسا غامض اسلوب اختیار کیوں کرے، جس کی رسائی معدود سے چند افراد کی فہم ہی تک ہو سکے اور اس کے بقیہ سارے بندے مفہوم و مدعا سے محروم رہیں۔

غرض، جیساکہ ہم نے لکھا ہے، کہ قرآن فن مباحثہ اور علم کلام کے قواعد و نظائر سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود منطقی اور کلامی طرز و اسلوب سے خالی ہے، اور اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ منطقی طرز استدلال اور کلامی اسلوب بربان اکثر و بیشتر مخاطب کو لاجواب اور ساکت تو کر دیتا ہے، لیکن اس کے دل سے تردد اور شک کے کانٹے نکال کر انشراح و اطمینان کی ٹھنڈک نہیں پہنچاتا۔ کیونکہ ایک مناظر کی ساری کاوشیں اس بات میں منحصر ہوتی ہیں کہ وہ مخاطب کو کسی نہ کسی طرح ساکت کر دے، اس لئے وہ ذہنی کشتی کے سارے داؤ پیچ سے مسلح ہو کر حریف پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کبھی الزام و معارضہ سے کام لیتا ہے کبھی اپنے استدلال کے مقدمات مغالطوں سے تیار کرتا ہے اور کبھی مخاطب کے کلام کی جراحی کر کے اس کی دو جنون شقیں نکالتا ہے۔ ہر شق کے مختلف گوشے پیدا کرتا ہے اور پھر ہر گوشے پر نقض و ایراد کی بارشیں شروع کر دیتا ہے تاکہ مخاطب کا ذہن مرعوب اور اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ جائے۔

لیکن دعوت حق کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، داعیِ حق کی شان متکبرانہ چیلنج بازی کی نہیں ہوتی

بلکہ اس کا مقصد ہدایت ہوتا ہے جو صرف اذعان و یقین سے حاصل ہو سکتی ہے اور یہ اذعان و یقین بحث و نزاع کے الجھاوے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ مخاطب کے دل سے شکوک کے کانٹے نکال کر اس میں حق اتارنے کی سعی سے ہی ممکن ہے، اس لئے قرآن نے استدلال کے جو اسالیب اور براہین کے جو پیرائے اختیار کئے ہیں، ان سے باطل کا سارا زور بھی ٹوٹ جاتا ہے اور تردد و شک کے سارے کانٹے بھی دل سے نکل جاتے ہیں اور انسان اگر معقولیت پسند ہے تو وہ محض ساکت اور لاجواب ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ انشراح صدر کے ساتھ حق کے قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ بھی پاتا ہے۔

اب ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں، جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن کس طرح فن مباحثہ اور علم کلام کے قواعد و ضوابط اپنے اندر رکھنے کے باوجود برہان و حجت کی وہ زبان استعمال نہیں کرتا جو منطق اور کلام کی زبان ہے۔

۱۔ توحید کے باب میں قرآن نے ایک جگہ یوں استدلال کیا ہے۔

لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ یعنی اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین و آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا

اس استدلال کی نوعیت وہی ہے، جسے فن مناظرہ اور علم مباحثہ میں برہانِ تمانع کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن برہان تمانع سے کام لیتے وقت جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس کے بجائے اسلوب ایسا اختیار کیا گیا کہ غامض انداز اور تعقیدی پیرایہ سے ایک طرح کی جو وحشت پیدا ہوتی ہے، وہ بھی پیدا نہ ہو اور فائدہ وہی حاصل ہو جو برہان تمانع سے کام لینے کا ہوتا ہے۔ ہر شخص عوام میں سے ہو یا خواص میں سے، ذہین اور طباع انسان ہو یا متوسط یا ادنیٰ درجہ کا ذہن رکھنے والا سب کی سمجھ میں بات یکساں طور پر آجائے، ورنہ اگر فنی طریقہ اختیار کیا جاتا تو بقول صاحب "اتقان" یوں کہا جاتا کہ اگر دنیا کے دو یا زیادہ صانع ہوتے تو نظام کائنات کے باب میں ان کی تدبیریں ہر قدم اور ہر مرحلہ پر یکساں اور ہم آہنگ نہ رہتیں اور ان کے احکام میں اتحاد و اتفاق نہ ہوتا اور یقیناً ان دونوں صانعوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو عاجز و مغلوب ہونا پڑتا، کیونکہ اگر ان میں سے ایک صانع مثلاً کسی جسم کی زندگی چاہتا اور دوسرا صانع اس جسم کو مارنے کا ارادہ کرتا تو ایسی شکل میں یا تو ان دونوں کے ارادوں کی تنفیذ کے سبب فساد و تناقض پیدا ہو جاتا کیونکہ اگر اتفاق کو فرض کیا جائے تو فعل کا تجزی محال ہے اور اگر اختلاف کو فرض کیا جائے تو اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے جو محال ہے یا دونوں میں سے کسی صانع کا ارادہ نافذ نہ ہوتا تو دونوں صانع عاجز قرار پاتے حالانکہ خالق و صانع کو عجز سے پاک اور قادر ہونا چاہیئے۔ یا دونوں میں سے کسی ایک صانع کے ارادے کی تنفیذ نہ ہوتی تو پھر اس کا عجز ثابت ہوتا ہے حالانکہ خدا کو عاجز نہ ہونا چاہیئے۔

بھلا بتایئے کہ اس گورکھ دھندے والے انداز استدلال کو پوری طرح کتنے لوگ سمجھیں گے پھر اس انداز گفتگو سے اس بات کا پورا امکان ہے کہ انسان کے دل کو وحشت ہونے لگے اور وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگ کھڑا ہو، لیکن قرآن نے یہی بات بیان کی اور اسی زبان سے کام لیا، لیکن کس قدر عام فہم اور دلکش طریقہ اختیار کیا، اور ایسا پیرایہ اختیار کیا جو سہل ممتنع ہے اور جس سے فائدہ وہی سب کچھ حاصل ہو جو برہان تمانع سے کام لے کر فنی زبان استعمال کرنے کا ہوتا ہے۔

۲۔ فن بحث و مناظرہ کی ایک اصطلاح "قول بالموجب" ہے جس کی حقیقت ابن ابی الاصبع کے قول کے مطابق یہ ہے کہ فریق مخالف کے کلام کو اسی کے فحوائے گفتگو سے رد کر دیا جائے، مثلاً قرآن حکیم نے منافقین کے ایک قول کی حکایت اس طرح کی ہے۔

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لا یعلمون	یہ منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے، حالانکہ عزت تو خدا کے لئے ہے اور اس کے رسول کی اور مومنوں کی لیکن منافق نہیں جانتے

منافقین نے اپنے اس جملہ میں لفظ اَعَزّ اپنے گروہ کے لئے اور اَذَلّ کا لفظ مومنین کے لئے بطور کنایہ استعمال کرکے اپنی جماعت کے لئے یہ بات کہی تھی کہ وہ مومنین کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ اس کی تردید میں صفت عزۃ منافقین کے برعکس مومنین کی جماعت کے لئے ثابت کی گئی، گویا یوں کہا گیا کہ ٹھیک ہے معزز لوگ وہاں سے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے، مگر وہ ذلیل اور نکالے ہوئے لوگ خود منافقین ہوں گے اور اللہ اور اس کا رسول اور مومنین وہ معزز ہیں جو نکالنے والے ہوں گے۔

۳۔ فن مباحثہ کی ایک اصطلاح "تسلیم" بھی ہے، یعنی امر محال کو فرض کر لیا جائے، خواہ منفی بنا کر یا حرف امتناع سے مشروط کرکے، تاکہ شرط کے ممتنع الوقوع ہونے کی بنا پر امر مذکور کا واقع ہونا بھی محال ہو اور پھر اس کے بعد اس امر کا وقوع بطور تسلیم جدلی مان لیا جائے پھر اس کے واقع ہونے کے مفروضہ سے اس کے بے فائدہ ہونے پر دلیل قائم کی جائے، مثلاً:۔

ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الٰہ اذا لذھب کل الٰہ بما خلق ولعلا بعضھم علی بعض۔ (القرآن)	اللہ نے کسی کو نہ تو اپنا بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔

مطلب یہ کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ شریک نہیں اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ الٰہ واحد کے علاوہ اس کا کوئی شریک بھی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر خالق و صانع اپنی اپنی مخلوق کو الگ کرکے

اور ہر ایک دوسرے پر برتری اور غلبہ چاہے اور پھر دنیا میں کوئی امر اور کوئی حکم نافذ نہ ہو سکے۔ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ واقعہ اس کے خلاف ہے، نہایت نظم و ترتیب اور نہایت ہم آہنگی کے ساتھ نظام کائنات کارفرما ہے، لہٰذا چونکہ دو یا اس سے زیادہ الٰہ کے فرض سے فرض محال لازم آتا ہے، اور یہ فرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے وقوع کا مفروضہ ایک بحث و جدل فائدہ ہوگا اس لئے اسے فرض کرنا ہی محال ہے۔

۴۔ فن مباحثہ کی ایک اور اصطلاح "انتقال" ہے یعنی ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف رجوع۔ اس کی مثال وہ حجت ابراہیمی ہے، جس کی حکایت قرآن مجید نے کی ہے اور جس سے منجملہ اور تعلیم کے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ دعوت حق کی راہ فلسفیانہ موشگافیوں کی راہ نہیں ہے، اس لئے داعی حق کے مکالمے منطقیانہ ردو قدح سے نہیں بلکہ حکمت اور موعظہ حسنہ اور جدال احسن کی جلوہ سامانیوں سے معمور ہونے چاہئیں۔

یہ حجت ابراہیمی وہ مکالمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نمرود کے درمیان ہوا تھا۔ قرآن اس کی حکایت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان آتاہ اللہ الملک۔	کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیم سے حجت و تکرار کی تھی، حجت و تکرار اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔

یعنی۔ نمرود اپنے اقتدار و فرماں روائی کے گھمنڈ میں اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھ رہا تھا اور اپنے اوپر کسی ایسے بالاتر اقتدار کا منکر تھا جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو اور اس فریب میں مبتلا تھا کہ چونکہ اہل ملک کی معاشی ضروریات، ان کی عزت و ناموس اور ان کی جان و مال اس کے قبضۂ اقتدار میں ہیں، اس لئے وہ ان کا "رب" ہے لیکن حضرت ابراہیم اس کے اس غرور حکمرانی پر ضرب لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ربی الذی یحیی و یمیت" میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اس کے جواب میں نمرود نے مجادلانہ رویہ اختیار کیا اور اس نے حضرت ابراہیم کی دلیل کے جواب میں کہا کہ "انا احیی و امیت" (جلانے اور مارنے والا تو میں ہوں) اہل ملک کی گردنیں میرے قبضے میں ہیں، میرے ایک اشارۂ ابرو سے انسان کا سر اس کے دوش سے جدا ہوتا ہے اور جسے چشم عنایت سے دیکھ لوں، وہ زندگی کی نعمتوں سے کھیلتا ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ نمرود نے ایک واجب القتل قیدی کی جان بخشی کر کے اسے آزاد کر دیا اور ایک بے گناہ شہری کو قتل کرا دیا اور کہا کہ دیکھا، میں جس کو چاہوں مارتا ہوں اور جسے چاہوں نہیں مارتا۔

ظاہر ہے کہ نمرود کا یہ جواب نہایت نامعقول اور انتہائی مضحکہ خیز تھا، اس نے حضرت ابراہیمؑ کے استدلال میں ذکر کردہ الفاظ "احیاء" (جلانا) اور "اماتت" (مارڈالنا) کا یا تو مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھا یا سمجھکر رکیک تاویل اور سطحی مغالطہ کا سہارا لینا چاہا۔

نمرود کی اس کج فہمی اور سفیہانہ جواب پر ایک مناظر اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لے سکتا تھا کہ اس کا ناطقہ بند ہو جاتا، مگر حضرت ابراہیمؑ ایک داعی حق تھے کوئی مناظر نہ تھے، ان کی راہ دعوت و تلقین کی راہ تھی نہ کہ جدل و خصومت کی، اور داعی حق کے پیش نظر ہوتا ہے کہ اپنے مخاطب کے دل میں کسی طرح حق اتار دے نہ یہ کہ اسے بحث و نزاع میں سراسیمہ کر کے چھوڑے، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ ان کے طرز استدلال کو نمرود کا دماغ ہضم نہ کر سکا تو وہ اپنی دلیل پر اڑے نہ رہے بلکہ فوراً دوسری بات پیش کر دی کہ اچھا، اگر تیری قدرت و اختیار کی وسعت ایسی ہی ہے تو :-

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق	اللہ جو میرا رب ہے) سورج کو مشرق سے
فات بھا من المغرب۔	نکالتا ہے، تو ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا۔

تیر نشانہ پر لگا فبھت الذی کفر۔ وہ نمرود جس نے کفر و سرکشی کی روش اختیار کی تھی، یہ جواب سن کر مبہوت و ششدر رہ گیا۔

اس طرح ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف رجوع کر کے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کو یہ حقیقت بتائی کہ جو ہستی اس کائنات کی خالق ہے اور جس کے تکوینی امر کی اطاعت یہ نظام عالم کر رہا ہے وہی ہستی حاکم مطلق اور "رب" ہونے کی مستحق ہے، اور جس طرح وہ خالق کائنات ہے، اسی طرح وہ کائنات کی حاکم و مالک بھی ہے اور حکومت و اقتدار کا یہ تخت اسی کا بخشا ہوا ہے جس پر تو بیٹھا ہے، لہٰذا تجھے چاہیئے کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ تصور کرتے ہوئے کار حکومت اس طرح انجام دے کہ اس کی زمین پر اس کی مرضی پوری ہو۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ آپ کے سامنے رکھی گئی ہیں، ورنہ استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو بحث و استدلال کی تقریباً ساری انواع اپنی اصلیت و حقیقت کے لحاظ سے قرآن میں موجود ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، بحث برائے بحث اور مباحثہ مخاطب چونکہ مقصود قرآن نہیں، اس لئے پیرایۂ بیان اور طرز استدلال کلامی نہیں ہے بلکہ خطیبانہ ہے اور نہایت موثر ہے۔

قرآن حکیم نے بحث و استدلال کی تمام انواع کو اپنے دامن میں رکھنے کے باوجود وہ طرز اور وہ پیرایہ اختیار نہیں کیا جو بحث و مناظرہ کا فنی طرز اور پیرایہ کہا جاتا ہے اور وہ زبان

استعمال نہیں کی جو علمی اور فنی زبان کہی جاتی ہے۔ اس میں جو حکمتیں ہیں، ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان حکمتوں کے علاوہ ایک حکمت اور ایک بڑا سبب اور ہے، وہ یہ کہ قرآن کریم رہتی دنیا تک کے لئے ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے اور زمانے کے حدود میں مقید بحث و استدلال کے کسی فن کا طرز پیرایہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ہر زمانے کے کام آسکے۔ ایک زمانے میں جس قسم کا علمی مذاق ہوتا ہے اور گفتگو کے جیسے کچھ اپروچ (Approach) کا چلن ہوتا ہے دوسرے زمانے میں وہ بدل جاتا ہے، یونانی فلسفہ کے عروج کے زمانے میں جو پیرایۂ استدلال تھا، وہ آج نہیں ہے، آج کا جو طرز استدلال اور طریقۂ حجت ہے [illegible] روشِ زمانہ اسے کب بدل دے اور کونسا پیرایۂ بیان اور طرز استدلال دور حاضر کے طرز استدلال کی جگہ لے لے۔

آج اذہان و قلوب پر اثر ڈالنے کے لئے سائنٹفک طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یہ سائنٹفک طریقہ یونانی فلسفہ کے طریقہ سے قطعی مختلف ہے۔ لیکن قرآن کے طرز استدلال کی یہ خوبی بلکہ صحیح تر لفظوں میں معجزانہ شان ہے اور جو بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک دلیل ہے کہ رہتی دنیا تک کے ہر دور کی ہر ذہنی سطح اس سے مستفید ہو سکتی ہے اور ہر زمانہ کا انداز استدلال، اگر اسے زبان مل جائے تو وہ بے اختیار بول اٹھے کہ :-

دیکھنا تقریر کی خوبی کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ قرآن کا طرز استدلال اپنے اندر سائنٹفک طریقۂ استدلال کے سارے لوازم اور ساری بنیادیں بھی رکھتا ہے اور آج کا انسان بھی قرآن کے پیرایۂ بیان اور طریقۂ استدلال سے اسی طرح متاثر ہو سکتا ہے جس طرح قدیم زمانے کا ذہن متاثر ہو سکتا تھا۔

اسے اگر آپ سمجھنا چاہیں تو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہر زمانے کا انسان اپنے ذہن و فکر کے مراتب کے لحاظ سے چند طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- نہایت ذہین اور طباع لوگ، جن کے لئے اشارات و کنایات کافی ہوتے ہیں اور جو محض اجمالی و اشاراتی طریقہ سے بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں انہیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے توضیحات و تفصیلات کی ضرورت نہیں ہوتی، قرآن میں ایسے اذہان و قلوب کی ہدایت کے لئے اجمالی اور اشاراتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ العصر اس کی بہترین مثال ہے، کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور جس کی وسعتِ معنی تک رسائی زیرک اور ذکی انسان کی ہو سکتی ہے اور وہی اس سے کما حقہٗ فائدہ اور حقیقی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

۲- وہ لوگ جو اپنے ذہن کے لحاظ سے بلند تو کہے جا سکتے ہیں، [illegible] اپنے طبقہ [illegible]

کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے معتدل طریقہ تعلیم اختیار کیا جاتا ہے، یعنی بات کو قدرے وضاحت اور تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ فرمایا کہ:۔

یا ایہا الناس اعبدوا ربکم (یعنی، لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے رب کی تو خدا ہی کی عبادت و اطاعت کے مطالبہ کی علت اور وجہ کے طور پر آگے یہ فرمایا:۔

الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون الذی جعل لکم الارض فراشاً والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقاً لکم فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون۔

(اس رب کی، جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں ان سب کا خالق ہے تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے (ہاں) وہی (رب) جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کی چھت بنائی اور آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ۔

گویا اللہ کی عبادت و اطاعت کے مطالبہ کی دلیل کے طور پر آگے کی توضیحات وتشریحات ہیں مطلب یہ کہ تمہیں اللہ ہی کی عبادت و اطاعت اس لئے کرنی چاہیئے کہ وہی تمہارا رب ہے، وہی تمہارا اور تم سے پہلے کے لوگوں کا خالق بھی ہے، اسی نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا........ الخ

۳۔ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جس کی ذہنی سطح ایسی ہوتی ہے کہ اس کے لئے نہ صرف یہ کہ اشارات وکنایات ناکافی ہوتے ہیں بلکہ بات کو پوری وضاحت کے ساتھ بھی رکھدیا جائے، تو بھی وہ حقیقت کو نہیں پاتا، ایسے طبقہ کے لئے محسوس اور مشاہد طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے اذہان وقلوب کو متاثر اور مطمئن کرنے کے لئے جو طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے، اسے تمثیلی طریقہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، چنانچہ امثال القرآن اسی لئے ہیں کہ ان سے ایسے لوگ فائدے اٹھائیں، مثلاً قرآن میں انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق ایک یہ مثال بیان ہوئی ہے کہ اس کی مثال اس بیج کی سی ہے جسے زمین میں بویا جاتا ہے کہ جب اس کو بویا گیا تو محض ایک دانہ تھا، لیکن بار آور ہوا تو ایک دانہ سے سات بالیں نکل آئیں اور ہر بال میں سو دانے نکل آئے۔ اسے دور حاضر کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ طریقہ *From Known to unknown* کا ہے یعنی مخاطب کو اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کہ ملی ضرورتوں میں اور دین کی سربلندی کے لئے خرچ کرنا کتنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے فوائد و برکات کتنے عظیم الشان ہیں، لیکن وہ یہ جانتا

ہے کہ ایک دانے کا صحیح وقت پر زمین میں ڈالنا کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور وہ ایک دانہ کتنے بے شمار دانوں کے ساتھ خود اسی کی طرف لوٹ آتا ہے، لہٰذا اس کے اس علم سے کام لیتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات راسخ کی گئی کہ دینی مطالبات اور ملی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر ایک پیسہ کا خرچ بھی اپنے اندر کتنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ثمرات و نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اور اس کا وہ ایک پیسہ اس کے حق میں کتنا بڑا سرمایہ بنے گا۔

۴۔ کچھ لوگوں کا ذہن تاریخی قسم کا ہوتا ہے یعنی وہ واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، ان کے لئے جو طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ آجکل کی زبان میں Story Method کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ہدایت اور انشراح صدر کے لئے قصص القرآن کا حصہ ہے۔

پھر یہی قصص القرآن ہیں، جو استقرائی طریقہ استدلال کا کام دیتے ہیں اور آج کل قدیم منطق کی جگہ جس منطق نے لی ہے، اس کا نام استقرائی منطق ہے۔ اگرچہ یہ کچھ دور جدید کی مخترعانہ علمی کاوش نہیں ہے بلکہ صدیوں پیشتر فارابی نے ارسطو کی "استخراجی منطق" کے مقابلہ میں جس "تحلیلی منطق" کا علمی دنیا کے سامنے فتح باب کیا تھا، آج وہی "تحلیلی منطق" ہے جس نے "استقرائی منطق" کے نام سے اپنی بساط بچھا رکھی ہے۔ بہر حال، اس استقرائی طریقہ کی مختصر توضیح یہ ہے کہ قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف انبیاء کی دعوتِ حق کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ردّ و انکار کے نتائج بیان کئے ہیں۔ اس طریقہ استشہاد سے مخاطبین کے ذہن میں یہ بات بٹھانی مقصود ہے کہ جب ہر زمانے میں دعوت حق کے قبول و انکار کے ردّ عمل کے طور پر یہ عواقب و نتائج نکلے ہیں تو قرآنی دعوت کے ردّ و قبول کے بھی یہی نتائج نکلیں گے گویا قرآن اپنی صداقت میں استقرائی طریقہ استدلال سے کام لیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ تم سارے داعیان حق کو دیکھ جاؤ، ان کی دعوت کو دیکھ جاؤ۔ سب کی زندگی میں یکسانیت نظر آئے گی، سب کی دعوت بھی ایک ہی رہی ہے، سب کی دعوت کے قبول کرنے والوں کے ساتھ معاندین نے یکساں معاملات کئے ہیں، سب کی دعوت کو ردّ کر دینے والوں کے سامنے نتائج ایک ہی قسم کے سامنے آئے ہیں۔ یہ یکسانیت، یہ تسلسل، یہ غیر منقطع اعادہ اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ یہ اللہ کی سنت ہے، جو ہمیشہ سے ایک ہی طرح کارفرما رہی ہے، لہٰذا آج قرآن کے ساتھ اور رسول کی دعوت کے ساتھ، رسول اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ جو طرز عمل انسان اختیار کریں گے، نتائج و عواقب ویسے ہی نکلیں گے جیسے ہمیشہ نکلتے آئے ہیں، یعنی قبول کرنے والوں کی فلاح اور انکار کرنے والوں کے لئے خسران۔

دوسری طرف ان قصص القرآن کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف بھی ہے، اور انھیں گویا متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ تم اس سنت اللہ کی کارفرمائیوں سے مستثنیٰ رہ جاؤ گے اور اگر تم نے اپنے آپ کو امم سابقہ کے اعمال کا مظہر بنایا تو محض زبان سے تمہاری "مسلمانیت" کا ادعا

تمہارے لئے سپر کا کام دے گا اس لئے گذشتہ قوموں پر گذرے ہوئے حالات سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کہ اگر تم نے بھی اللہ کی ہدایتوں پر عمل سے گریز کیا تو اسی تباہی و بربادی سے تمہیں بھی دو چار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی اور فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصہ میں آتی رہی ہے کیونکہ خدائے لم یلد ولم یولد سے تمہارا کوئی رشتہ تو ہے نہیں؟ "نحن ابناءُ اللہ واحباءُہٗ" (ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں) کے زعم فاسد میں اگر تم بھی مبتلا ہو گئے تو "ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباءُو بغضبٍ من اللہ" (ذلت وخواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے) کے تم بھی مصداق بنو گے اور جب اللہ کی سنت اور قدرت کا اٹل قانون اپنی گرفت میں لینے کے لئے حرکت میں آجائے گا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس تقدیر الٰہی کو پلٹ نہ سکے گی۔ اس سنت کے مقابلہ میں کسی شخص، کسی گروہ اور کسی قوم کے ساتھ کوئی رعایت نہیں، یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، جس کے لئے کسی زمانے کی قید نہیں اور جو سب کے لئے برابر ہے۔

سنۃ من ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلاً (القرآن)

یہ ہماری سنت ہے، جسے ان سب رسولوں کے معاملہ میں ہم نے برتا ہے جنھیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہماری سنت میں تم کبھی تغیر نہ پاؤگے

۵۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اذہان و قلوب کے لئے عبرت و بصیرت کے سامان سیر و سیاحت میں ہوا کرتے ہیں۔ خدا سے سرکش قوموں کی بستیوں کے وہ کھنڈر جو زبان حال سے اپنی بپتا سنا رہے ہیں یا آثار قدیمہ کی کھدائی اور انکشافات کے ذریعہ ان کے دلوں پر دستک دی جا سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ARCHEOLOGY سے دلچسپی اور مناسبت رکھنے والوں کے لئے بھی قرآن نے ایک طرز استدلال اختیار کیا ہے، یعنی قرآن نہ بیان و تشریح سے کام لیتا ہے، نہ تمثیل و قصص سے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اقطار عالم میں جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ مجرمین کو کن حالات سے دو چار ہونا پڑا اور انہیں ان کے انکار و اعراض کے عمل نے کیسے روز بد دکھائے۔ "من اشدُّ منّا قوۃ" (ہم سے بڑھکر طاقتور اور زبردست کون ہے) کے پندار میں مبتلا ہو کر انہوں نے جب دعوت حق سے روگردانی کی تو اس کا خمیازہ انہیں کیا بھگتنا پڑا۔ خدائی ہدایتوں سے ان کی بے نیازی اور خدا کی زمین کو فواحش و منکرات سے بھر دینے والی ان کی سرگرمیاں کیا رنگ لائیں۔ اپنے رب سے غفلت اور آخرت فراموشی نے کس طرح اپنی شامت آپ بلائی۔

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان

تم میں سے پہلے بہت سے دور گذر چکے ہیں، تو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ہدایات ربانی کی

عاقبۃ المکذبین۔ (القرآن)
تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا

فمنھم من ارسلنا علیہ حاصباً ومنھم من اخذتہ الصیحۃ ومنھم من خسفنا بہ الارض ومنھم من اغرقنا وما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ (القرآن)

توان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دہلکے نے آلیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کردیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین (القرآن)

کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے، اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور ابھرتی بھی ہیں، لیکن اس عروج وزوال کی نوعیت دوسری ہوتی ہے، یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان آئے اور قوم کی قوم کو تباہ کرکے رکھدے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں اخلاق اور قانونی اعتبار سے اس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہ راست مخاطب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملہ سے بالکل مختلف ہے۔ جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلا واسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہونچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کردے، اس پر خدا کی حجت پوری ہوجاتی ہے، اس کے لئے معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کے رسول کو دو بدو جھٹلا دینے کے بعد وہ اس کی سزاوار ہوجاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چکا دیا جائے۔ معاملہ کی یہ نوعیت ان قوموں کے معاملہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس پیغام الٰہی براہ راست نہ آیا ہو بلکہ مختلف واسطوں سے پہونچا ہو۔

لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ اب ان قوموں پر عذاب آنے بند ہوگئے جو خدا سے برگشتہ اور فکری وا خلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں، چھوٹے چھوٹے جھنجوڑنے والے عذاب بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کن عذاب بھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "پومپی آئی" کا مشہور زلزلہ وہاں کے باشندوں کی بداعمالیوں کی بنا پر عذاب الٰہی نہ تھا، لیکن وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وقت سے پہلے آگاہ کئے جانے کا سوال نہیں اور کوئی

نہیں جوا نبیا رعلیہم الصلواۃ والسلام اور آسمانی کتابوں کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی معنی کی طرف انسانوں کو توجہ دلائے، بلکہ اس کے برعکس مادہ پرستانہ ذہنیت اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبیعیاتی قوانین سے کر کے انسان کو بھلادے میں ڈالتی رہتی ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتی کہ اوپر کوئی خدا بھی موجود ہے جو اپنی کائناتی قوتوں کے ذریعہ غلط کار قوموں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دیتا ہے۔

قرآن کے ان اسالیبِ استدلال سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن سائنس اور دوسرے علوم جدیدہ کو شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیتا۔ ہر زمانے کا ہر علم، وقت کا ہر فن اور عروج وارتقا کی ہر حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے، جسے وہ جہاں پائے لے لینی چاہیئے، بلکہ کائنات کا ہر خزانہ اور دنیا کا ہر سرمایہ انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کے خالق و مالک کے نام لیوا دوسروں کی بہ نسبت اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھائیں، لیکن فرق ہے اور بہت بڑا فرق، ان سرمایوں اور حکمتوں کے حصول ہی کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں اور ان کو خدا کی زمین پر خدا کا کلمہ بلند کرنے کے وسائل کے نقطۂ نظر سے حاصل کرنے میں جس طرح فرق ہے چراغ سے راستہ دیکھنے کا فائدہ اٹھانے میں اور چراغ پر پروانوں کی طرح نچھاور ہونے میں۔ فزکس ہو یا کیمسٹری، زولوجی ہو یا جیالوجی، کوئی علم اور کوئی فن ہو، آپ اسے بشوق حاصل کریں، بلکہ آپ کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے، لیکن ان علوم و فنون سے فلسفۂ الحاد کی نری تقلید میں اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ دنیا کا یہ سارا کارخانہ اور یہ نظامِ کائنات ایک اندھی فطرت، بے جان مادّہ اور بے حس الکٹرون (Electrons) کی خاصیتیں اور کرشمہ سازیاں ہیں، تو یہ آپ کے لئے وہ "روشنی طبع" قرار پائے گی جو انسان کے حق میں "بلا" ثابت ہوتی ہے، اس کے برخلاف اگر آپ نے ان علوم و فنون سے حاصل کردہ اپنی معلومات کو کام میں لاکر یہ غیر معلوم حقیقت پالی کہ آپ کا، یعنی انسان کا فرضِ منصبی کیا ہے اور وہ کیوں آیا ہے، تو پھر ان علوم کی بدولت آپ کے حق میں آسمان اپنی برکتیں نازل کرے گا اور زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔

اب اخیر میں قرآن حکیم کی یہ ایک اور آیت بھی سن لیجیئے کہ :۔

کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہیں میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت کریمہ کے جملہ۔ "و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون" (اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے) پر خاص طور سے غور کیجئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قرآن عزیز نے اپنے دلائل و براہین میں انسان کے مشاہدوں اور اس کے تجربوں اور اس کی مختلف النوع سابقہ معلومات ہی کو اس کے سامنے رکھکر ان غیر معلوم حقائق سے اس کو آگاہ کیا ہے۔ جنہیں وہ نہیں جانتا تھا؟ تو پھر اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ "معلوم سے نامعلوم کی طرف" بڑھنے (From Known to un-Known) کا اصول سیکھنے والوں نے دراصل اسلام ہی سے سیکھا ہے جسے ایک بھاری بھرکم اصطلاح کا لباس پہنا کر خود کو "کریڈیٹ" لینا چاہتے ہیں؟

قرآنی قصص سے دراصل مقصود بنی نوع انسان کو ذکر و تذکیر کے ذریعہ راہ راست پر لانا ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے تمام کتب الہیہ کے اس طرح کے مضامین کے لئے تین اصول مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ اگر ان اصولوں کے پیش نظر قرآنی قصص کو پڑھا جائے تو یہ قصے اعلیٰ روحانیت پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

قرآنی قصص سے دراصل مقصود بنی نوع انسان کو ذکر و تذکیر کے ذریعہ راہ راست پر لانا ہے۔ قرآن شریف سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذکر یعنی مطلق تذکیر کے لئے نازل ہوا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولقد یسرنا القرآن للذکر فہل من مدکر۔ غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان قصوں کو محض کہانیاں سمجھ لیا۔ کسی نے تذکیر کے خیال سے ان پر مطلق غور نہ کیا۔ عام واعظ اور قصہ گو محفل کی دلچسپیوں کی خاطر ان آیات میں حسب مرضی تصرف بھی کرتے رہے۔ اسی طرح انہوں نے قرآن کے قصوں کو بازیچہ اطفال بنالیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان تمام قصوں کو حسب ذیل تین اصولوں کے ماتحت ترتیب دی ہے ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم ان قصوں کے ذریعہ "الاء اللہ" "ایام اللہ" اور موت "مابعدہ" کا بار بار ذکر کر کے انسان کو گمراہیوں سے بچنے اور راستی پر چلنے کی تلقین کرتا ہے ان قصوں سے اس کا مقصود اصلی ان تین باتوں کی تذکیر ہے۔

(از شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مصنفہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ)